پروفیسر احمد سعید

سرسیّد اور علمائے دیوبند

بقول مولانا حالی "سرسیّد احمد خاں نے مذہب کی آغوش میں پرورش پائی اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا" لیکن سرسیّد کے مذہبی خیالات کے بارے میں اُن کی زندگی ہی میں بے حد اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ ایک عام تاثر یہ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان کے علمائے کرام اُن کو ملحد سمجھتے تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے علمائے دیوبند نے کبھی بھی سرسیّد کو ملحد تصوّر نہیں کیا۔ ان تمام لوگوں میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اور مولانا اشرف علی تھانوی شامل ہیں۔ اگرچہ یہ تمام حضرات مغربی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی ترقی کے نظریہ کے خلاف تھے لیکن ان حضرات نے کبھی بھی سرسید کو بد دین، ملحد اور دہریہ نہیں سمجھا۔

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی

حضرت حاجی صاحب نے ایک مرتبہ سرسیّد احمد خان کو ایک خط نصیحت کے طور پر بھیجنا چاہا اور اس کے لیے مسودات طلب فرمائے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے لیے مسودات تیار کیے لیکن مولانا اشرف علی تھانوی کا مسودہ حضرت حاجی صاحب نے پسند فرمایا۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا:

"بخدمت جناب عالی مرتبت مجمع الاخلاق و الطاف سلمہم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم! ہر چند کہ مجھ کو آپ سے صوری نیاز حاصل نہیں۔ مگر آپ کے اخلاق کے اوصاف سن کر غائبانہ تعلق ضرور ہے جس نے اس عرض کی جرأت دلائی ہے۔ آپ میری گمنامی اور ناشناسائی پر نظر نہ فرمائیں بلکہ "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" کو پیش نظر رکھیے۔ اب بنام خدا شروع کرتا ہوں۔ جہاں تک آپ کی مساعی و تصانیف کو غور کر کے دیکھا معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں۔ خیر خواہی اسلام و خیر خواہی مسلمانان جنے اس امر پر مجبور

کیا کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین کے ہیں ان کے جواب دیئے جائیں۔ خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوتی کہ مسلمان جو پستی میں گرے ہیں ان کو ترقی پر لے جایا جائے۔ ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی کو کلام نہیں مگر غور طلب بات یہ ہے کہ ان کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں"[۱]

مولانا رشید احمد گنگوہی

جس وقت سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تو انھوں نے ایک خاص معتمد کو بھیجا کہ وہ مولانا گنگوہی سے ملاقات کرکے مولانا کو یہ پیغام پہنچائے کہ میں نے مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے کالج کی بنیاد ڈالی ہے۔ دوسری قومیں ترقی کرکے آگے نکل چکی ہیں۔ مسلمان پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر آپ حضرات میرا ہاتھ بٹائیں تو میں بہت جلد اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاؤں گا جو حقیقت میں مسلمانوں کی کامیابی ہے۔ وہ سفیر گنگوہ آئے اور سر سید کا پیغام مولانا گنگوہی کو دیا۔ مولانا رشید احمد نے جب سر سید کا پیغام سنا تو انھوں نے فرمایا:

"بھائی ہم تو آج تک مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ترقی کا راستہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اتباع میں سمجھتے رہے مگر آج یہ معلوم ہوا کہ ان کی فلاح وبہبود کا کوئی اور راستہ بھی ہے تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ میری ساری عمر تو قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسولؐ میں گذری ہے مجھے ان چیزوں سے زیادہ مناسبت نہیں"۔ پھر آپ نے مولانا محمد قاسم کا نام لیا کہ وہ ان باتوں میں مبصر ہیں ان سے ملو جو فرمائیں گے ہم ان کی تقلید کریں گے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

جب یہ سفیر مولانا محمد قاسم کے پاس پہنچے اور حضرت گنگوہی کا جواب ارشاد فرمایا تو مولانا نے کہا کہ "بات یہ ہے کہ کام کرنے والوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک نیت اچھی ہے مگر عقل نہیں۔ دوسری عقل اچھی ہے مگر نیت اچھی نہیں۔ تیسرے نہ عقل اچھی نہ نیت اچھی۔ سر سید کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عقل اچھی نہیں۔ کیونکہ جس زینے سے مسلمانوں کو معراج ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا سبب سمجھتے ہیں یہ ہی مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہوگا"[۲]

۱؎ سیرت اشرف۔ عبدالرحمٰن۔ ملتان۔ ص ۱۸۰، ۲؎ الافاضات الیومیہ جلد چہارم تھانہ بھون ۱۳۵۸ھ ص ۴۹۲

سرسید کی زندگی ہی میں ان کی مذہبی تحریروں نے جو شکوک وشبہات پیدا کیے اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ نواب محسن الملک نے بائبل کی نامکمل تفسیر دیکھی تو ان کو اس کی عبارت اتنی شاق گذری کہ سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے نواب صاحب کو یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مخالفین نے ان کی زندگی ہی میں کفر کے فتوے جاری کیے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ایک فتویٰ کفر مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے پیش کیا کہ وہ اس پہ دستخط کردیں۔ مولانا نے ان لوگوں سے کہا کہ بھئی میں پہلے تحقیقات کرلوں کہ آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نے تین سوالات لکھ کر سرسید احمد خاں کو بھیجے۔

(۱) خدا پر آپ کا عقیدہ کیا ہے۔

(۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا عقیدہ ہے اور

(۳) قیامت کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے۔

سرسید نے ان سوالات کے جوابات میں لکھا :

(۱) خدا تعالیٰ مالک ازلی ابدی وصانع تمام کائنات ہے۔

(۲) بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(۳) قیامت برحق ہے۔

جب یہ جوابات مولانا محمد قاسم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان لوگوں سے جو فتویٰ پہ دستخط کے لیے آئے تھے کہا۔ "تم اس شخص کے خلاف دستخط کروانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے"۔[۵۳]

مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی

ایک بار کوئی مولوی صاحب سرسید کے بارے میں تذکرہ کررہے تھے کہ اس نے شریعت محمدی میں بڑا تنزل اور اختلاف پیدا کیا ہے۔ ہزاروں حملے شریعت پہ کیے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے یہ باتیں سن کر کہا۔ "ان کی ظاہری تقریروں کو نہ دیکھو ان کے قلب کو دیکھو کیسا ہے"۔

مولانا محمد علی مونگیری خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن نے بھی فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت قبلہ حجرہ میں

---

۵۳ مقالات یوم شبلی۔ عبیداللہ خان لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۶۹

بیٹھے تھے کہ چند مولوی صاحبان صحن میں لڑ رہے تھے کہ سرسیّد روایاتِ صحیحہ کا انکار کرتا ہے تواتر کا انکار کرتا ہے، کافر ہے۔ حضرت قبلہ حجرہ میں بیٹھے تھے۔ حجرہ سے باہر نکلے، مسجد میں تشریف لائے اور حضرت مونگیری سے فرمایا: "یہ مولوی صاحب لوگ اس بے چارہ کو کافر بناتے ہیں مگر اس کے قلب کو دیکھو کہ کیسا ہے"۔

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ملفوظات میں جا بجا سرسیّد کا تذکرہ ملتا ہے۔ مولانا تھانوی بھی دیگر اکابرین کی طرح سرسیّد کے مخالف نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی فلاح وبہبود ممکن نہیں اور وہ سرسیّد کالج کو فالج کہتے تھے لیکن انھوں نے سرسیّد کی ذات پر حملے کبھی نہیں کیے نہ ہی ان کو کبھی کافر کہا۔

ایک مرتبہ فرمایا: "بڑا شخص چاہے دنیادار ہو یا دین دار، اس میں استغنا ضرور ہوتا ہے۔ فرمایا کہ علی گڑھ کے اسٹیشن پر سرسیّد ریل میں سوار ہوتے اس ڈبہ میں پہلے سے ایک اور شخص سوار تھے سرسیّد سے پوچھا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ انھوں نے کہا علی گڑھ۔ جواب سن کر وہ صاحب بولے کہ وہی علی گڑھ جس میں سرسیّد (ایسا تیسا) رہتا ہے۔ سرسیّد نے کہا جی ہاں وہی علی گڑھ۔ اس پہ ان صاحب نے سرسیّد کو بُرا بھلا کہا۔ سرسیّد نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ یہ صاحب اور کھلے اور کئی اسٹیشن تک تبرا کرتے گئے۔ سرسیّد کو ذرا بھی تغیر نہیں ہوا۔ آخر ایک اسٹیشن پہ تبرا کرنے والے صاحب نے کھانا نکالا اور سرسیّد کو دعوت دی۔ سرسیّد نے انکار کیا۔ انھوں نے کہا مصنوعی تواضع نہیں، میری دلشکنی ہوگی۔ سرسیّد نے کہا مجھ کو واقعی عذر ہے۔ انھوں نے عذر پوچھا۔ سرسیّد نے کہا اگر میں اس وقت بتلاؤں تو اس وقت تو آپ کھانے پر مصر ہیں۔ اور معلوم ہو جائے تو شاید میری صورت دیکھنا گوارا نہ کریں۔ انھوں نے کہا یہ کون سی بات ہے۔ سرسیّد نے تب کہا کہ میں وہی سرسیّد ہوں۔ یہ سن کر وہ صاحب بہت ہی شرمندہ ہوئے۔" اس کے بعد مولانا تھانوی نے فرمایا: "باوجودیکہ سرسیّد ایک دنیادار شخص تھے مگر استغنا اور حوصلہ تھا۔"[۵۴]

---

[۵۴] الافاضات الیومیہ۔ جلد اول تھانہ بھون ص ۲۶

شاہ غلام علی کے متعلق ایک واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: "حضرت شاہ صاحب (غلام علی) کی عظمت ان کے دل میں اس قدر تھی کہ نام سُن کر از خود رفتگی طاری ہو گئی۔"

مولانا تھانوی کا یہ خیال تھا کہ سرسید کی نیت تو بُری نہ تھی۔ مسلمانوں کا ہمدرد تھا۔ مگر عقل دین کی کمی کی وجہ سے جو راہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ترقی کے لیے نکالی وہ مضر ثابت ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود دنیا کو سمجھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میرٹھ آنے پر ایک رئیس نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو دین چاہتے ہو یا دنیا، اور جواب واقعی سچا دیا کہ "نہ میں دین چاہتا ہوں نہ دنیا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے بھائی ننگے بھوکے نہ رہیں۔"

سرسید کے خلوص اور ملّی ہمدردی کی وہ قدر کرتے تھے اور اس کا اعتراف بھی ان الفاظ میں کیا ہے:۔ "عیب جملہ می گفتی ہنرش نیز بگو۔" سرسید کو مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی بہت ہی دھن تھی اور اس معاملہ میں بڑی دلسوزی تھی۔ کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صفت پر رحم فرمائیں۔"

مولانا تھانوی سرسید کی اس صفت اور خاص طور سے اکابر کے ساتھ ان کے حسنِ عقیدت کے واقعات اکثر بیان کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ "سرسید کا عقیدہ توحید و رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا بلا وسوسہ اور نہایت پختہ تھا، جیسا کہ ان کی بعض تصانیف سے مجھ کو ظاہر ہوا اور قرآن و حدیث کی یہ جو توجیہات انھوں نے کیں ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ گو اس کے لیے جو طرز انھوں نے اختیار کیا وہ غلط تھا اسی لیے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں۔"[۵۵]

دینی امور میں سرسید کی مداخلت کو مولانا تھانوی ان کی شدید غلطی اور بدنامی کا سبب سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتے تو ان کی ملی خدمات کا ساری دنیا اعتراف کرتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "فلاں مصلح قوم (سرسید) میں قومی ہمدردی ضرور تھی مگر بُرے طریقے سے ظاہر ہوئی اگر یہ شخص دین میں دست درازی نہ کرتا تو اچھا آدمی تھا۔"[۵۶]

---

۵۵ اشرف السوانح خواجہ عزیز الحسن لاہور ص۲۱۴

۵۶ حسن العزیز۔ مولوی محمد یوسف بجنوری۔ تھانہ بھون جلد سوم ص۱۲۷

"بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر اس نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر اپنے آپ کو بدنام کیا ورنہ تمام لوگ اس کو دنیا کا پیشوا ضرور بنا لیتے - بڑا محبِ قوم تھا - دین میں رخنہ اندازی کرنے کی وجہ ہی سے بہت سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے اسی سے نقصان ہوا[۵۷]"

مولانا تھانوی نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ سر سید کا مقصد محض انگریزوں کی خیر خواہی تھا اور اس بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ : "یہ جو مشہور ہے کہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا یہ غلط ہے بڑا دانشمند تھا - یہ سمجھتا تھا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر ان سے بگاڑ کر کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے ان سے مل کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں[۵۸]"

ایک مرتبہ فرمایا کہ "کسی نے سر سید کی ہجو میں نظم لکھی اور اس کو کالج کے دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر پڑھا - سر سید احمد نے مکان سے نکل کر کہا خدا کا شکر ہے کہ میری قوم یاد تو کرتی ہے اور پچیس روپے ان صاحب کو دیئے" پھر فرمایا : "وہ صاحب بھی کمال کرتے ہیں وہ روپے لے اس سے سر سید کا بہت ہی متحمل ہونا ثابت ہے[۵۹]"

---

۵۷ جدید ملفوظات سہارن پور جلد دوم ص ۲۲۷ ۵۸ ایضاً، ص ۲۲۸

۵۹ حسن العزیز - مولوی محمد یوسف - جلد دوم ص ۱۲۷

حیاتِ محمدؐ

از : محمد حسین ہیکل مترجم : ابو یحییٰ امام خان

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب اور محقق محمد حسین ہیکل کی مشہور و معروف تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات نہایت موثر اور دلنشین انداز میں لکھے گئے ہیں اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے ان پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق زندگی کے بنیادی حقائق اور دور کے اہم مسائل سے ہے -

قیمت : ۲۲/۵۰ روپے

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور